ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی

گاہے گاہے باز خواں .....

"آل انڈیا نمائش پنجاب مشاعرہ - لاہور ۱۹۲۷"

۱۹۲۷ء کے اواخر میں برطانوی حکومت کی طرف سے لاہور کے اقبال پارک میں، جو اُس وقت منٹو پارک کہلاتا تھا، مصنوعات کی ایک بہت بڑی نمائش کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اپنی وسعت اور پھیلاؤ کے لحاظ سے یہ نمائش بے مثال تھی۔ اتنی عظیم نمائش پھر کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ زندگی سے متعلق تقریباً تمام لوازم کے سٹال اس میں موجود تھے، ہر سٹال دوسرے سے بڑھ کر سجا ہوا اور اشیا سے بھرا ہوا نمائش گاہ میں داخل ہو کر آدمی حیرت میں کھو کھو جاتا تھا۔ نہ صرف پنجاب بلکہ دوسرے صوبوں کے لوگ بھی یہ نمائش دیکھنے کے لیے آتے۔ روزانہ ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں تماشائی یہاں پہنچتے، اور اس وقت کی آبادی کے مطابق یہ ریکارڈ تعداد تھی۔ اس میں عام سٹالوں سے ہٹ کر لوگوں کی تفریح کے لیے کچھ اور سامان بھی کیا گیا تھا، جس میں ایک جھیل نما نہر بھی تھی۔ اس نہر میں کشتیاں چلتیں، ان کے لیے معمولی سا ٹکٹ تھا، اسی طرح کے کچھ اور سلسلے تھے۔ ورائٹی پروگراموں کے لیے ایک عارضی تھیٹر بنایا گیا تھا، جس میں موسیقی اور شعر و شاعری کے پروگرام ہوتے تھے۔ اسی تھیٹر میں ایک محفل موسیقی کے موقعے پر اس وقت کے مشہور گلوکار آنجہانی سہگل کو بُری طرح ہوٹ کیا گیا اور بعض راویوں کے مطابق اس پر ٹماٹر پھینکے گئے۔ غرض نمائش کیا تھی، لاہور کا ایک تاریخ ساز واقعہ تھا۔ افسوس کہ اس کی تفصیل بیان کرنے سے حافظہ اس وقت عاجز و قاصر ہے۔ اس لیے کہ راقم اس وقت بچپن کی حدود سے نکل کر لڑکپن میں قدم رکھ رہا تھا۔ تاہم مقام شکر ہے کہ مرحوم میاں بشیر احمد، مدیر ہمایوں نے اس نمائش کے ایک مشاعرے میں پڑھے جانے والے کلام کے خاصے حصے کو "ہمایوں" کے اوراق میں محفوظ کر لیا، اور اس وقت "ہمایوں" کا یہی خاص شمارہ ہمارے پیشِ نظر ہے جس کی چند جھلکیاں "المعارف" کے قارئینِ باتمکین کو بھی دکھائی جاتی ہیں۔

جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے یہ "آل انڈیا نمائش پنجاب مشاعرہ" تھا، جو انجمن اردو پنجاب کے

زیرِ اہتمام ۳۰ اور ۳۱ دسمبر ۱۹۳۷ء کو منعقد ہوا۔ اس میں برِ صغیر کے تقریباً تمام شعرا نے شرکت کی۔ اس میں نظموں کا ایک انعامی مقابلہ بھی ہوا، اور طرحی غزلوں کے علاوہ غیر طرحی غزلیں اور موضوعی نظمیں بھی پڑھی گئیں۔ جن شعرا نے اس میں حصہ لیا، ان میں قابلِ ذکر یہ ہیں: زیب عثمانیہ، حاجی لق لق، عرش ملسیانی، الطاف مشہدی، ساغر نظامی، روش صدیقی، خوشی محمد ناظر، فیضی جالندھری، وقار انبالوی، پروفیسر عبداللطیف تپش، برجموہن کیفی دتاتریا دہلوی، سراج لکھنوی، تاجور نجیب آبادی، اودھے سنگھ شائق، ڈاکٹر تاثیر، جوش ملسیانی، اصغر حسین خان نظیر، جوش ملیح آبادی، خواجہ دل محمد، احسان دانش، عابد علی عابد، حفیظ ہوشیارپوری، صوفی تبسم، پروفیسر فیض احمد (فیض)، خلیفہ عبدالحکیم، محمد علی اثر رام پوری اور نواب احمد یار خاں دولتانہ وغیرہم۔ انعامی نظم کے تین عنوانات "مقصدِ حیات"، "ہمارا وطن" اور "دیہات کا ایک منظر" تجویز ہوئے تھے۔ مقابلے کے لیے سو سے زائد نظمیں اور غزلیں موصول ہوئیں، جن میں سے تین کا انتخاب کیا گیا۔ یعنی دو نظمیں اور ایک غزل۔ بہترین نظم کے لیے "انجمن اردوئے پنجاب" کی طرف سے ایک طلائی تمغہ اور مصرع ہائے طرح[1] میں سے کسی ایک پر بہترین غزل کے لیے کرنال شاپ انارکلی لاہور کی جانب سے ایک طلائی تمغہ انعام میں رکھا گیا۔ کسی موضوع پر بہترین مزاحیہ نظم کے لیے بھی ایک طلائی تمغہ مقرر کیا گیا۔

سنجیدہ نظم "مقصدِ حیات" کا انعام زیب عثمانیہ بیگم ایس بہاءالدین نے، اسی موضوع پر مزاحیہ نظم پر انعام حاجی لق لق نے اور غزل کا انعام بالمکند عرش ملسیانی نے حاصل کیا۔ اس سے پہلے کہ یہ انعام یافتہ منظومات ہدیۂ قارئین کی جائیں، اس مشاعرے سے متعلق مرحوم میاں بشیر احمد کی رپورٹ اور چودھری غلام حیدر خاں ناظمِ ادارہ "زمیندار" لاہور کے تبصرے سے کچھ اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں:

میاں بشیر احمد نے "بزمِ ہمایوں" کے ذیلی عنوان "آل انڈیا نمائش کا مشاعرہ" کے تحت اس مشاعرے کو ملک میں اردو کی بڑھتی ہوئی ہردلعزیزی کا ایک کامیاب اور دل خوش کن مظاہرہ قرار دیتے ہوئے لکھا:

"مشاعرے کے شروع ہونے کے وقت بوندا باندی ہو رہی تھی۔ اس پر پنجاب کے بڑے دنوں کی سردی

---

[1] علامہ اقبال کا یہ مصرع: پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے۔ اور یہ دو مصرعے:

صد شکر کہ پھر زیست کا ساماں نظر آیا ؎ حالِ دل بھی سنا کے دیکھ لیا

اور ستم ڈھا رہی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ساری نمائش گاہ میں جہاں ہر روز ایک ایک لاکھ تماشائی ہوتے تھے، ایک آدھ سینکڑہ آدمی بھی موجود نہ تھے، لیکن کارکنانِ انجمن کے تعجب کی انتہا نہ رہی جب دو گھنٹے کے اندر اندر بارش کے ہوتے ہوئے ایک ہزار سے زائد لوگ ہال میں جمع ہو گئے۔ شرح ٹکٹ تین روپے، ایک روپیہ اور آٹھ آنے تھی۔ ہال بھر گیا تو لوگ باہر برآمدوں میں سننے کی خاموش کوشش کرتے رہے۔ اس کے مقابلے میں اس کے بعد جب پنجابی اور ہندی کے دربار بلکہ کوئی دربار منعقد ہوتے تو باوجود اس کے کہ موسم نہایت خوش گوار تھا اور ٹکٹ ایک روپیہ اور آٹھ آنے اور چار آنے تک کے تھے مگر ہال کا دو تہائی حصہ خالی تھا اور جو ایک تہائی پُر تھا، اس میں بھی زندگی کے ساتھ زندہ دلی اور گرم جوشی اور لطف اندوزی کے بہت کم آثار پائے جاتے تھے۔ انجمن کی محنت ٹھکانے لگی، قومی زبان کی جادو اثری سے بلا امتیاز مذہب و ملت لوگوں کو مسرور دیکھ کر مشقت کی یاد ادبی مسرت سے بدل گئی۔"

اس کے بعد میاں مرحوم نے دوسری زبانوں کو بھی سراہتے ہوئے اور ان سے کسی قسم کا تعصب برتے بغیر اردو کی ہر دلعزیزی اور شیرینی کا تذکرہ کیا اور کہا ہے کہ:

"اردو شاعری ... وہ چشمۂ شیریں ہے کہ ہر مذہب و ملت کے لوگ اس کے گرد آکر خود بہ خود جمع ہو جاتے ہیں۔" انھوں نے بعض لوگوں کی طرف سے مشاعروں پر کیے جانے والے اعتراضات کا رد بھی سنجیدہ انداز میں کیا ہے۔ ان کے بقول بعض لوگ مشاعرے کو اس عملی زمانے میں خرافات سے زیادہ وقعت نہیں دیتے۔ میاں مرحوم لکھتے ہیں:

"آج کل کے عملی زمانے کے لیے سائنس باعثِ افتخار ہے، لیکن بے کس عورتوں اور ننھے بچوں پر بم گرانے والی بھی سائنس ہی ہے۔ ہر شے، اگر اس کا استعمال صحیح ہو، صحیح ہے اور اگر اس کا استعمال غلط ہو، غلط ہے۔ یہی حالت مشاعروں کی ہے ... مشاعرے صحیح انسانی اور قومی زندگی کی تصویر بن سکتے ہیں۔ جب وہ ایسے بنیں اور ایسے ہوں تو اردو مشاعرے بلاشبہ زندگی اور زندہ دلی کے جیتے جاگتے نمونے ہوتے ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ ہم انھیں برا سمجھیں۔"

اب مشاعرے کی کسی قدر تفصیل ہے: "... مشاعرے کی تین نشستیں تھیں۔ ۳۰ دسمبر کو پہلی نشست ½۱۰ صبح سے ایک بجے تک تھی۔ اس کے صدر دیوان بہادر راجہ نریندر ناتھ تھے۔ دوسری نشست ۲ بجے سے ۶ بجے شام تک جاری رہی اور تیسری ۳۱ دسمبر کو ½۲ بجے سے ½۶ بجے شام تک۔

ان دونوں کی صدارت آنریبل سر عبدالقادر ممبر انڈیا کونسل نے فرمائی۔ راجہ صاحب نے ایک دلچسپ افتتاحی تقریر کی، جس میں انھوں نے مشاعروں کی تاریخ بیان کی اور کہا کہ مشاعرے خاص طور پر اردو زبان اور اردو شاعری کی پیداوار اور اس کا دلچسپ اور مفید نتیجہ ہیں۔ سر عبدالقادر نے مشاعرے کے دوران میں جابجا نہایت پُر لطف نکتے بیان کیے اور "مخزن" کا زمانہ یاد دلا دیا۔"

پھر شعرا کے نام گنوانے کے بعد انعامی نظموں کا اور "المنظر" لارنس روڈ لاہور میں شعرا کی دعوت کا ذکر کیا گیا ہے۔ المنظر میں، جو میاں بشیر احمد مرحوم کا مسکن تھا، دعوت کے بعد چھوٹا سا مشاعرہ ہوا جسے میاں مرحوم نے مزاح کے طور پر "مشاعری" لکھا ہے۔ یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو امتیاز علی تاج مرحوم نے ان شعرا کی چائے سے تواضع کی۔

اس مشاعرے کی کامیابی کو دیکھ کر بعض حضرات نے یہ تجویز کیا کہ لاہور میں ہر سال ایسے مشاعرے منعقد ہونے چاہئیں۔ لیکن جیسا کہ میاں مرحوم نے لکھا ہے" اگر یہ دوست اپنے وعدے یاد رکھیں گے تو ان کی تجویز کو ضرور عملی جامہ پہنایا جائے گا۔" معلوم ہوتا ہے ان حضرات کا یہ سارا جوش وقتی تھا اور سارے وعدے عارضی، کیوں کہ اس کے بعد کسی ایسے سال بسال مشاعرے کے بارے میں لاہور کی تاریخ خاموش ہے، وہ الگ بات کہ بعد میں مختلف مواقع پر بعض اچھے مشاعرے ہوئے، لیکن ان حضرات کے زیر اہتمام نہیں۔ راحل ہوشیارپوری نے اس مشاعرے کی چند ایک تاریخیں کہی تھیں، جن میں سے ایک یہ ہے "مشاعرہ آل انڈیا نمائش لاہور۔" ۱۳۵۶ھ

اس مشاعرے پر چوہدری غلام حیدر کا تبصرہ ۹ جنوری ۱۹۳۸ء کے زمیندار (لاہور) میں شائع ہوا۔ بعد میں انھوں نے اس میں کسی قدر اضافہ کر کے ہمایوں کے شمارۂ خاص "مشاعرہ نمبر" کے لیے بھجوا دیا۔ انھوں نے اس مشاعرے کو پنجاب کا "بلا شبہ عدیم النظیر" مشاعرہ اور میاں بشیر احمد کو اس مشاعرے کی "روح رواں" قرار دیا ہے۔ ان کے مطابق میاں بشیر کی "التماس" نے مشاعرہ کے ہال میں اس "زندہ دلی" کا قطعی طور پر سد باب کر دیا جس کا تختۂ مشق عام طور پر ان شاعروں کو بنایا جاتا ہے جن کا کلام ان سے خراج تحسین وصول کرنے میں ناکام رہتا ہے ۔۔۔ اس کے بعد انھوں نے ہندوؤں کی ذہنیت، تعصب اور اردو کی ہر دلعزیزی روزافزوں ترقی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

" سامعین میں ہندو، مسلمان اور سکھ سبھی شامل تھے، مگر مسلمانوں کی تعداد نسبتاً زیادہ تھی۔ مسلم خواتین

بھی موجود تھیں۔ اگرچہ اردو اور ہندی کی بحث نے ایسی ناگوار صورت اختیار کر رکھی تھی کہ ہندوؤں کا قوم پرست تعلیم یافتہ طبقہ اردو کو، جو گزشتہ چار پانچ صدیوں سے دونوں قوموں کے لسانی، معاشرتی اور تمدنی تعلقات کی ایک زندہ یادگار رہی ہے، صفحۂ ہستی سے مٹانے پر تُلا ہوا ہے۔ لیکن اردو کی جڑیں علم و ادب کی زمین میں اس قدر گہری اور دور چلی گئی ہیں کہ ان کا کاٹنا دشمنانِ اُردو کے لیے کوئی آسان کام نہیں کاش اردو کے دشمنوں کو اس امر کا احساس ہو کہ ان کی اردو دشمنی وطنی مفاد کے لیے کس قدر تباہ کن ثابت ہو رہی ہے۔ استخلاصِ وطن کے لیے ابنائے وطن کی ہم آہنگی ایک لازمی امر ہے، لیکن جب زبان ایک نہ ہو تو ہم آہنگی کیسے پیدا ہو سکتی ہے"

زیب عثمانیہ کو نظم میں پہلا انعام ملنے پر چوہدری موصوف نے اظہارِ مسرت کرتے ہوئے لکھا:

"ایک مسلم خاتون شاعرہ کی یہ کامیابی یقیناً قابلِ فخر ہے اور میرا ایمان ہے کہ اگر حوا کی بیٹیوں کو صحیح تعلیم دی جائے اور ان کی حوصلہ افزائی کی جائے تو وہ اپنے علم و عمل سے ملک و ملّت کی زندگی میں حیرت انگیز انقلاب پیدا کر سکتی ہیں۔ کیا یہ انقلاب نہیں کہ انہی خواتین میں ایک ایسی خاتون بھی موجود تھی جس نے ایروپلین میں ۱۹ ہزار فٹ کی بلندی تک اپنی پرواز سے پانچ دریاؤں کی سرزمین میں ریکارڈ قائم کر کے دنیا کو دکھا دیا کہ شاعر کے طائرِ خیال کی طرح وہ بھی عالمِ بالا کی سیر کر سکتی ہے۔

مزاحیہ نظم کا انعام حاجی لق لق، مدیر "احسان"، کو ملا۔ اس کا ذکر کرنے کے بعد اس دور کی شاعری اور مذکورہ مشاعرے پر چوہدری غلام حیدر نے تبصرہ کیا۔

"زمانہ کی رفتار کے ساتھ شاعری کا رنگ بھی بدل گیا ہے۔ اقوام و ملل کے عروج و زوال سے شاعری بھی لازمی طور پر اثر پذیر ہوتی ہے۔ جب ہندوستان آزاد اور طاقتور تھا تو اس وقت شاعری کا رنگ کچھ اور تھا اور جب فرزندانِ ہند کی غلامی اور پستی کا دور شروع ہوا تو یہ رنگ بدل گیا۔ ذلت و نکبت کے احساس نے اب ایسے شاعر پیدا کر دیے ہیں جو رفعت و عظمت کے اعلیٰ مقام تک پہنچنے کے لیے لوگوں کے خیالات میں ایک زبردست انقلاب پیدا کرنا چاہتے ہیں . . . مشاعرہ میں جو کلام سنا یا گیا اس کی نسبت یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ انقلابی شاعری ایک سٹیم رولر ہے جو ہمارے مستقبل کی شاہراہ تیار کر رہا ہے۔ شاعری کا مقصد بھی یہی ہے کہ ایک مردہ قوم میں بیداری اور آزادی کا غیر فانی احساس پیدا کر دے۔"

چوہدری موصوف نے آخر میں "پنجاب کے بین الاقوامی اتحاد" کا مسئلہ حل کرنے کے لیے اردو شاعری کے

وجود کو ضروری اور انجمن اردو پنجاب کے پُرجوش اور مخلص سکرٹری میاں بشیر احمد کو مبارک باد کا مستحق قرار دیا ہے۔

مولانا حامد علی خاں حامد نے "اردو شعر کا ارتقائی مطالعہ —— بارھویں صدی سے بیسویں صدی تک" کے عنوان سے ایک مختصر سی تمہید کے ساتھ اردو شاعری کا مختصر انتخاب دیا ہے جو صرف چار صفحات کو محیط اور فرید الدین شکر گنج (۱۲۰۰ء) سے شروع ہو کر جوش ملیح آبادی پر ختم ہو جاتا ہے۔ (کل ۳۶ شعرا کا کلام شامل ہے۔) تمہید کا آغاز ملاحظہ ہو، جس میں خاں صاحب نے بڑے خلوص اور درد کے ساتھ قدیم اردو شاعری کا دفاع کیا ہے۔ یہاں یہ واضح ہو کہ چوہدری غلام حیدر اور خاں صاحب کا تعلق پنجاب سے ہے۔ اس سے پتا چلے گا کہ اہلِ پنجاب نے اردو کی ترقی و ترویج اور اس سے محبت کے اظہار کے لیے کیا کیا جتن کیے:

"جو لوگ عہدِ حاضر کی عمل آموز یا قومی نظموں کو دیکھ کر ہماری تمام پرانی شاعری کو خرافات کا مجموعہ قرار دیتے ہیں، ان کی نگاہ محض موجودہ عہد کی تنگ چار دیواری تک محدود ہے۔ اس دورِ اضطراب میں عمل! اعمل! اور جہاد! جہاد کی صدائیں قدرتی حالات کی تخلیق ہیں، لیکن سالہا سال قبل اور قومیت کے موجودہ تصورات کے پیدا ہونے سے پہلے جو شعرا انسان کی شخصی اور داخلی یا نفسیاتی کیفیات کے مرقعے پیش کرتے رہے ہیں، انھوں نے بھی انسانی ذہن کو جلا دینے اور مذاق کو سلیم بنانے کے علاوہ خود داری، ایثار، خلق و مروت اور درد و محبت وغیرہ کے لطیف جذبات کی تربیت کے سلسلے میں بنی نوعِ انسان کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اور یوں اس دنیا کے دردوغم کو تا بہ مقدور گوارا اور قابلِ برداشت بنانے کی کوشش کی ہے۔"

اب ذرا انعام یافتہ منظومات کی بات ہو جائے۔ زیب عثمانیہ نے اگرچہ "مقصدِ حیات" کو بطور نظم پیش کیا ہے اور مصنفین کے نزدیک بھی یہ نظم ہی ہے، لیکن حقیقت میں اس کا سانچا غزل کا ہے، محض عنوان جما دینے سے اسے نظم مان لیا گیا ہے۔ سات اشعار پر مشتمل یہ غزل نما نظم ملاحظہ ہو:

مقصدِ حیات

بھولے سے بھی نہ درد کو دل سے کبھی جدا سمجھ　　　شاہدِ دل نواز کی یہ بھی کوئی عطا سمجھ
امن کی آرزو نہ کر امن کی آرزو ہے موت　　　ہر نفسِ حیات کو درد میں مبتلا سمجھ

منزلِ ہست و بود میں تیرا مقام ہے بلند مہر و مہ و نجوم کو اپنے نشان پا سمجھ
شاہرہِ حیات میں رہبر و راہزن نہ بن اپنے سفر کا مدعا اس سے کہیں سوا سمجھ
تیرے حریم قلب کی خاک میں جب جمود ہو فتنہ کوئی اٹھا سمجھ حشر کوئی بپا سمجھ
تیری صفائے قلب کا دہر میں امتحان ہے خود کو بشر سمجھ مگر قدسیوں سے سوا سمجھ
پردۂ چشم سے ترے اشک جھلک رہے ہیں زیب دامنِ کائنات کو موتیوں سے بھرا سمجھ

حاجی لق لق مرحوم اپنے وقت کے بڑے مزاح نگار تھے۔ پہلے وہ "احسان" سے وابستہ رہے، پھر "زمیندار" میں ان کا مزاحیہ کالم چھپنے کے علاوہ ان کی مزاحیہ نظمیں اور ماڈرن غزلیں چھپا کرتی تھیں۔ ان کی نظموں میں، جیساکہ ان کی انعام یافتہ نظم میں آپ دیکھیں گے، حالاتِ حاضرہ اور سیاست پر ہلکے انداز میں چوٹ ہوتی تھی، یا پھر وہ اجتماعی اور معاشرتی خرابیوں، کوتاہیوں اور اسی قسم کے معاملات سادہ و دلکش اور ادبی چاشنی کے حامل مزاح میں پیش کرتے تھے۔ افسوس کہ آج ان کے بارے میں بہت کم لوگوں کو علم ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مرحوم کے بارے میں بھی ہمارے ادبی مجلات کوئی خاص نمبر نکالیں تاکہ ان کی نگارشات ضائع ہونے سے اور وہ خود قعرِ گم نامی میں گرنے سے محفوظ ہو جائیں۔ لیجیے ان کی نظم کے (جو مسدس کی صورت میں ہے) چند بند سنیے۔ شاعر اور لیڈر کی تعریف خاص طور پر قابلِ توجہ ہے:

مقصدِ حیات

زندگی کیا چیز ہے کس دیس کی سوغات ہے آؤ ہم بتلائیں کیوں جیتے ہیں ہم کیا بات ہے
زندگی اپنی نمائش گاہ مصنوعات ہے چار دن بجلی کے لمپ اور پھر اندھیری رات ہے
آئے ہیں دنیا میں ہم کچھ کام کرنے کے لیے
کچھ خدا سے اور کچھ بیوی سے ڈرنے کے لیے

ہے جوانوں کے لیے سینما میں جانا زندگی جیب میں پائی نہ ہو ٹائی لگانا زندگی
مہ وشوں سے باغ میں آنکھیں لڑانا زندگی غسل خانے میں اکیلے گنگنانا زندگی
عشق بازی اور موسیقی نہیں تو کچھ نہیں
اور کچھ کچھ مے سے دلچسپی نہیں تو کچھ نہیں

شعر کہنا بھی بنا جاتا ہے جزوِ زندگی　　نام چھپ جانا رسالے میں ہے حدِ شاعری
نثر میں اشعار کہہ لینا ہے اک صنعت نئی　　اور اگر یہ بھی نہیں خالی تخلص ہی سہی

نام کے ساتھ ایک دو الفاظ کی دم چاہیے
شعر بے معنی سہی لیکن ترنم چاہیے

زندگی کا ایک مقصد لیڈری کرنا بھی ہے　　چندہ کھا کر قوم کی الفت کا دم بھرنا بھی ہے
ملک پر جاں دینا، لفظی طور پر مرنا بھی ہے　　اس پہ وہ مُردہ باد کے نعروں سے کچھ ڈرنا بھی ہے

گرم جلسوں میں رہے ہنگامۂ کون و فساد
کان میں آتے رہیں بس نعرہ ہائے "زندہ باد"

سامنے مسجد کے گانے پر بھی جھگڑا چاہیے　　اور کبھی قومی ترانے پر بھی جھگڑا چاہیے
ہو سکے تو ذبح خانے پر بھی جھگڑا چاہیے　　اور کبھی کونسل میں جانے پر بھی جھگڑا چاہیے

بن کے لیڈر سو رہے تو زندگی کس کام کی
امن قائم ہو گیا تو لیڈری کس کام کی

زندگی کے اور مقصد بھی ہیں انساں کے لیے　　کوئی ایواں کے لیے ہے کوئی زنداں کے لیے
منتظر ہے کوئی جنگ روس و جاپان کے لیے　　زندگی لق لق کی ہے اخبار "احساں" کے لیے

مرا خامہ رات اور دن وقفِ لقلقیات ہے
چار دن کی چاندنی ہے پھر اندھیری رات ہے

مصرعِ طرح پر غزل میں انعام پنڈت بالمکند ملسیانی کو ملا۔ داغ کے رنگ میں ان کی غزل سادہ و رواں اور سہل ممتنع کی عمدہ مثال ہے۔ عرش ملسیانی ایک مدت تک مخزن کے شاعر رہے ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد بھی کافی عرصے تک ان کا کلام مخزن کے آخری دور کے شماروں میں اور بعد میں محترم حامد علی حامد کے رسالے الحمرا میں باقاعدگی سے چھپتا رہا ہے۔ ان کا کلام استادانہ رنگ کا حامل ہے۔ ملاحظہ ہو ان کی انعامی غزل۔ محاورے اور روزمرہ کی چاشنی کے سبب اس میں اہلِ زبان کی سی طرزِ ادا کی جھلک نمایاں ہے:

زخمِ دل بھی دکھا کے دیکھ لیا　　بس تمھیں آزما کے دیکھ لیا
داغِ دل سے بھی روشنی نہ ملی　　یہ دیا بھی جلا کے دیکھ لیا

شکوے مٹتے ہیں کیونکر آپ سے آپ — سامنے ان کے جا کے دیکھ لیا
مژدہ اے حسرتِ دلِ پرشوق — اس نے پھر مسکرا کے دیکھ لیا
نہ گئی ان کی تمکنت نہ گئی — بارہا سر جھکا کے دیکھ لیا
جو نہ دیکھا تھا آج تک ہم نے — دل کی باتوں میں آ کے دیکھ لیا
آبرو اور بھی ہوئی پانی — اشک حسرت بہا کے دیکھ لیا
لطف جو بےخودی میں تھا وہ کہاں — ہوش میں ہم نے آ کے دیکھ لیا
ترک الفت کے سن لیے الزام — "راز دل کو چھپا کے دیکھ لیا"
کوئی اپنا نہیں یہاں اے عرش — سب کو اپنا بنا کے دیکھ لیا

عرش ملسیانی کی غزل کے بعد "مقصدِ حیات" کے موضوع پر آغا آفتاب اطہر قزلباش اور الطاف مشہدی کی "قابل تعریف" نظمیں ہیں، جب کہ خواجہ معین الدین نے "خاتونِ ہند کا مقصدِ حیات" پر طبع آزمائی کی ہے۔ الطاف مشہدی مرحوم کی نظم کا انداز دعائیہ ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے قلم میں تاثیر کے لیے مختلف افرادِ معاشرہ کے حوالے سے حضورِ خدا دعا کی ہے، جو ان کی وطن سے محبت اور ان کے خلوصِ جذبہ اور سوز دروں کی غماز ہے:

مرے خامہ میں ایسی قوتیں ہوں مضطرب یارب

جو ماؤں کو کریں مجبور یہ آواز دینے پر
مرے نورِ نظر! جامِ شہادت جلد خالی کر
عروسِ نو کے دل میں جو کریں یہ آرزو پیدا
مرے شوہر کا خوں کر دے خزاں میں رنگ و بو پیدا
جو سینے کو عطا کر دیں وطن کی چاہ کی سوزش
جو شاعر کے تخیل میں بھریں اس آہ کی سوزش
کہ جس سے قصرِ استبداد میں ہلچل سی پڑ جائے
مرے اجڑے ہوئے ہندوستاں میں پھر بہار آئے
مرے خامہ میں ۔۔۔۔

ساغر نظامی نے اس مشاعرے میں موضوع "ہمارا وطن" کے سلسلے میں "ترانۂ وطن" کے عنوان سے آٹھ بندوں پر مشتمل طویل نظم سنائی، جسے حاضرین کی طرف سے بڑا خراجِ تحسین ملا۔ اگرچہ اس میں ان کے وطن پرستانہ جذبات کی بھرپور عکاسی ہوئی ہے، تاہم بعض اشعار سے ان کے نیشنلزم کی بھی بو آتی ہے۔ ساغر نے اس نظم میں ہیئت کا بھی تجربہ کیا ہے۔ غنائیت کے حامل الفاظ کے استعمال اور خود ہیئت ترکیبی سے نظم کا ہر ہر بند موسیقیت اور ترنم سے لبریز ہے: دو بند ملاحظہ ہوں:

اے وطن، اے وطن، اے وطن
جانِ من، جانِ من، جانِ من

(۱)

ذرے ذرے میں محفل سجا دیں گے ہم — تیرے دیوار و در جگمگا دیں گے ہم
تجھ کو ہستی کا گلشن بنا دیں گے ہم — آسمانوں پہ تجھ کو بٹھا دیں گے ہم
بن کے دشمن ترا جو اٹھے گا یہاں
اس کو تحت الثریٰ میں گرا دیں گے ہم
اور تحت الثریٰ کو فنا کے سمندر میں غرقاب کر کے بہا دیں گے ہم
اے وطن ——— اے وطن
سن لیں یہ انس و جان و زمین و زمن
اے وطن، اے وطن، اے وطن
جانِ من، جانِ من، جانِ من

(۲)

گلشنِ عیش و آرام و راحت ہے تو — بے کسی میں کنایہ محبت ہے تو
بے بسوں اور غلاموں کی دولت ہے تو — زندگی کے جہنم میں جنت ہے تو
سینچ کر خونِ دل سے تری کیاریاں
اور بھی تجھ کو جنت بنا دیں گے ہم
ہو وہ گلچیں کہ صیاد، دونوں کے سر تیرے قدموں پہ اک دن جھکا دیں گے ہم

اے وطن ـــــ اے وطن
ہم ترے پھول ہیں تو ہمارا چمن
اے وطن ، اے وطن ، اے وطن
جانِ من ، جانِ من ، جانِ من

چودھری خوشی محمد ناظر سابق گورنر کشمیر نے بھی اپنی منظومات میں وطن سے محبت کا اظہار کیا ہے۔ ناظر کی نظم کے تیسرے بند میں، جو برنگ غزل کہا گیا ہے، بلکہ تینوں بند غزل ہی کے روپ میں ہیں، ہندوؤں کے تعصب اور مسلمانوں کے لیے الگ وطن کے بارے میں بعض اچھوتے اشارے ملتے ہیں:

مدتوں مسلم یہاں مہماں رہا　　اب تو اس کو گھر بسانا چاہیے
گائے تو مالک ہے سب گھر بار کی　　اونٹ کو بھی کچھ ٹھکانا چاہیے
اب تو بھارت دیس کے زیرِ علم　　ترکی و تازی کو آنا چاہیے

وطن کے موضوع پر عرش ملسیانی، سمن رخ بانو، بیگم آغانہ، فیضی جالندھری، سید عنایت علی آغاز اور قدیر لکھنوی کی بھی منظومات شامل رسالہ ہیں۔

"دیہات کا ایک منظر" پر صرف جناب وقار انبالوی اور نذیر احمد ظفر کی نظمیں شامل ہیں۔ اس کے بعد طرحی غزلیں درج ہیں۔ سب سے پہلے داغ کی وہ غزل نقل کی گئی ہے جس سے مصرعِ طرح لیا گیا ہے:

جذبِ دل آزما کے دیکھ لیا　　اس نے کچھ مسکرا کے دیکھ لیا
لوگ کہتے تھے چپ لگی ہے تجھے　　حال دل بھی سنا کے دیکھ لیا

اس زمین میں صرف پروفیسر عبداللطیف تپش کی سنجیدہ اور حاجی لق لق کی مزاحیہ غزل شامل ہے۔ دونوں کے چند اشعار پیشِ خدمت ہیں:

تپش　　قصۂ غم سنا کے دیکھ لیا　　وہ چلے مسکرا کے دیکھ لیا
ہوگئی زندگی وبال مجھے　　تم کو دل سے بھلا کے دیکھ لیا
کچھ نہ تھا جز فریبِ رنگِ نمود　　نقشِ ہستی مٹا کے دیکھ لیا
جو تماشا تھا طور پر، ہم نے　　آگ گھر میں لگا کے دیکھ لیا

لق لق　　پارٹی میں بلا کے دیکھ لیا　　یار کو آزما کے دیکھ لیا

کوئی سنتا نہیں فغانِ غریب — ریڈیو پر بھی گا کے دیکھ لیا
ہے نہ فائر پروف جذبۂ عشق؟ — آپ نے دل جلا کے دیکھ لیا
نہیں ملتا ہمارے دل کا سراغ — ایکس رے بھی کرا کے دیکھ لیا
موت بھی ہم سے بھاگتی ہے دور — کار کے نیچے آ کے دیکھ لیا
میرے دل کی لگی نہیں بجھتی — برف میں دل لگا کے دیکھ لیا
یہ جراثیمِ عشق مر نہ سکے — ہم نے ٹیکا کرا کے دیکھ لیا

دوسرے مصرع طرح "پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے" پر کہی گئی سات منتخب غزلیں درج کی گئی ہیں۔ برجموہن کیفی، سراج لکھنوی، تاجور نجیب آبادی، اودے سنگھ شائق، پرنسپل محمد دین تاثیر، پرنسپل رام پرشاد ناشاد اور جوش ملسیانی کی یہ غزلیں نصف صدی قبل کی اردو شاعری کی گویا نمائندہ غزلیں ہیں۔ ان غزلوں سے شعرا کی ریاضت و محنت کا تو پتا چلتا ہے اور زبان اور محاورہ پر ان کا عبور بھی واضح ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان اساتذہ کی تمام تر پختہ کاری اور استادی کے باوصف ان کی ان غزلوں میں آج کی غزل کے مقابلے میں جان ذرا کم ہی ہے، بہر حال اردو غزل کے ارتقا کے باب میں ان کا اپنا ایک مقام ضرور ہے اور ان کا یہی مقام اس بات کا متقاضی ہے کہ ان کا کچھ انتخاب یہاں دیا جائے۔ تو ملاحظہ ہو:

کیفی: فراہم ہو کے خونِ آرزو پھر دل نہ بن جائے — یہ اُجڑی پر سکوں بستی بھری محفل نہ بن جائے
جو از خود رفتۂ راہِ عشق میں ہیں ہو نہیں سکتا — کہ منزل ان کے حق میں دوری منزل نہ بن جائے

سراج لکھنوی: یہ مشکل اور بھی اے ضبطِ غم مشکل نہ بن جائے — سمٹ کر دل کی آہوں کا دھواں پھر دل نہ بن جائے
جو پیکر میں نہ ہو تبدیل وہ احساسِ غم کیا ہے — تجھے راحت کہاں یہ درد جب تک دل نہ بن جائے

سراج کے دس اشعار میں سے سات اشعار کا قافیہ "دل" ہے اور یہ بات خاصی تعجب خیز ہے کہ سراج ایسے استادِ وقت کو اس میں کیا مشکل درپیش آئی جو وہ دوسرے قوافی سے استفادہ نہ کر سکے۔

تاجور نجیب آبادی: وہ رازِ عشق جس کو میں نے دل سے بھی چھپایا تھا — خدارا اے جنوں، افسانۂ محفل نہ بن جائے
ترے انوار سے ہے نبضِ ہستی میں تڑپ پیدا — کہیں سارا نظامِ کائنات اک دل نہ بن جائے

اودے سنگھ شائق: ابھی اس سے محبت میں بہت کچھ کام لینے ہیں — یہ بے تابی کہیں بڑھ کر سکونِ دل نہ بن جائے

	نشیمن پھونک دے، لیکن نشیمن پھونکنے والے	جنوں پختہ نہ ہو جائے، جنوں کامل نہ بن جائے
تاثیر:	وہی بیتابیاں اس کی، وہی بیباکیاں اس کی	یہ اب تک جو مرا دل تھا یہ تیرا دل نہ بن جائے
	سمجھ جانے اگر تو بن کہے، میں چپ رہوں لیکن	مجھے ڈر ہے مری مشکل تری مشکل نہ بن جائے
ناشاد:	حجاب جلوۂ لیلیٰ جنون دل نہ بن جائے	نگاہ شوق یارب پردۂ محمل نہ بن جائے
	سنبھل کر وادیٔ اُلفت میں اے ناشاد تم چلنا	کہیں پہلا قدم ہی آخری منزل نہ بن جائے
جوش ملسیانی:	وہ حسرت کیا جو آنکھوں سے نہ ٹپکے اشک بن بن کر	وہ ارماں کیا جو آخر اضطراب دل نہ بن جائے
	معاف اے شوق دل کب تک کروں یہ برق رفتاری	مجھے ڈر ہے یہ منزل آخری منزل نہ بن جائے

تیسری طرحی غزل کا مصرع "صد شکر کہ پھر زیست کا ساماں نظر آیا" جوش کی ایک غزل سے لیا گیا تھا اس سے متعلق ہمایوں کے اس خاص شمارے میں صرف دو غزلیں درج ہیں، اصغر حسین خاں نظیر اور پنڈت دلستہ پرشاد فدا کی۔ پہلی غزلوں کی طرح یہ بھی منتخب غزلیں ہیں، دیگر پڑھی جانے والی غزلیات کا اندازہ انھی دو سے بہ خوبی ہو سکتا ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

نظیر:	ظاہر نظر آیا کبھی پنہاں نظر آیا	وہ جلوہ بہر حال درخشاں نظر آیا
	رگ رگ میں محبت کی تپش دوڑ گئی جب	ہر ذرہ مرے جسم کا تاباں نظر آیا
	اک شہر غم و یاس ہر اک گام پہ دیکھا	ہر ذرے کے پہلو میں بیاباں نظر آیا
پنڈت فدا:	رونق میں وہ جتنا بھی نمایاں نظر آیا	اتنا ہی جنوں مجھ میں فراواں نظر آیا
	دوڑائی نظر دیدۂ عبرت نے جدھر بھی	ہر خندۂ گل خار بداماں نظر آیا
	بھٹکا یا سرابوں نے فدا راہ وفا میں	نزدیک جو آئے تو بیاباں نظر آیا

اس کے بعد مشاعرے میں پڑھی جانے والی چند منتخب نظمیں ہیں۔ خرابات از جوش ملیح آبادی، اگر نظم کا عنوان "خرافات" ہوتا تو مناسب رہتا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

یہ خرابات ہے تقویٰ کا نہیں نام یہاں	عین طاقت ہے تماشائے لب بام یہاں
میکدے میں نہ ہو لے شیخ حرم نکتہ فروش	کہ ازل سے نہیں گنجائش اوہام یہاں
میکدے کا ہے مشیت کے اشاروں پہ مدار	جام در دست ہیں خود شرع کے احکام یہاں
طوطیٔ قدس ہے اک رشتہ بپا صید زبوں	طائر سدرہ ہے اک مرغ تہِ دام یہاں

گوشِ رندان قدح خوار ہے اور لعل لگا — لب جبریل نہیں وہ خود پیغام یہاں

ساغر نظامی نے "جہانِ آزاد" کے عنوان سے نظم پیش کی۔ اس میں انھوں نے دیارِ آزادی کی تعریف بیان کی ہے کہ اس میں کیا کیا خوبیاں اور کیفیات ہوں تو وہ دیارِ آزادی کہلانے کا مستحق ہوتا ہے:

جہاں غلام ہیں پروردگارِ آزادی — جہاں کا بندۂ ادنیٰ ہے رشکِ صد معبود

ہے موج موج جہاں آبشارِ آزادی — جہاں ہے موجۂ خونِ شہید کوثرِ شوق

جہاں کی قید ہے حسنِ بہارِ آزادی — جہاں کے طوق و سلاسل ہیں زیورِ گل

اپنے سانچے اور انداز کے لحاظ سے یہ دونوں نظمیں درحقیقت مسلسل غزلیں ہیں۔

خواجہ دل محمد مرحوم کے نو دوہے بھی اس شمارے کی زینت بنے ہیں:

رات ہے کھڑکی بند کر گھر میں دیا جلا — آنکھیں موند جہان سے پی سے پریم لگا

میرا سب کچھ ہو گیا تو گر میرا ہوئے — میرا میرا سب کہیں تیرا کہے نہ کوئے

جھلکے تارا دور سے، راہ نہ جاؤں بھول — اٹا پڑا ہے راستہ گرے پات اور پھول

مشاعرے میں پڑھی گئی احسان دانش کی نظم "پردہ" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے، بقولِ جناب دانش انھوں نے یہ نظم اپنے ایک مخلص اور بے تکلف دوست نواب مجید الدین خاں کے ایک فقرے سے متاثر ہو کر کہی۔ یہ نظم چھوٹے بڑے آٹھ بندوں پر مشتمل ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے دوست سے پردے پر بحث کرتے ہوئے اسے بے جا قرار دیا ہے۔ پھر ایک مسلمان عورت کے حوالے سے بتایا ہے کہ ہم جو پردہ کرتی ہیں تو دراصل اپنی غربت و ناداری کو چھپانے کے لیے کرتی ہیں:

آہ یہ پردہ نہیں ہے مفلسی کی اوٹ ہے — تیری کج بحثی ہماری بے بسی پر چوٹ ہے

آنکھ بھر آئی ندامت سے پسینہ آگیا — سن کے اس کی گفتگو احسان میں تھرا گیا

دل کے پردے جل اُٹھے راز آشنائے دل ہو گیا — ملتِ مسلم کی بدحالی کا قائل ہو گیا

رسم پردہ مسلمہ کی بے بسی کا ہے حجاب

پردہ داری ہے یہ ناداری کے چہرے پر نقاب

روش صدیقی کی "زبورِ حریت" بھی آٹھ بندوں پر مشتمل ہے۔ اس میں انھوں نے غلامی کے خلاف اپنے شدید ردِ عمل کا اظہار کیا اور اخوت و مساوات اور حریت کا گیت گایا ہے:

خاک خود بیں ہو تو ہو جوہر قابل پیدا — دل ہو آزاد تو ہو مرگ سلاسل پیدا
صف شکن چاہیے جہاں، ہو وہیں منزل پیدا — جوش طوفاں ہی سے ہو جاتے ہیں ساحل پیدا
دل ہر قطرہ کو آمادۂ طوفاں کر دیں

پروفیسر عابد علی عابد نے اپنی مختصر سی نظم "صبح بہار" میں بعض مناظر قدرت کی دلچسپ تصویر کشی کر کے آخر میں مطرب خوش لہجہ اور ساقی نوخیز سے اپنا راگ اور گردش جام جاری رکھنے کی التماس کی ہے:

فطرت نے لیا ہاتھ میں انوار کا نیزہ — اہریمن ظلمات کے سینے میں اتارا

حفیظ ہوشیارپوری نے "سرمایہ دار" میں سرمایہ دار کی لوٹ مار اور ستم کاری و رعونت کی عکاسی کر کے فاقہ مستوں کو اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کے لیے اکسایا ہے۔

صوفی غلام مصطفےٰ تبسّم نے رابرٹ برجز کی ایک نظم کا منظوم ترجمہ "پیمان وفا" مشاعرے میں سنایا۔ یہ نظم ایک شوہر کے نام ہے جو سفر پر جا رہا ہے۔ دو دو شعروں کے آٹھ بندوں پر مشتمل اس نظم کے ہر بند کا چوتھا مصرع اس بات پر ختم ہوتا ہے:

میں تجھے جانے نہ دوں گی اے مری جان وفا — میں تجھے جانے نہ دوں گی اے مرے صبر و قرار

ایک بند ملاحظہ ہو:

دیکھ ہے چاروں طرف کالی گھٹا چھائی ہوئی — ہے زمیں کے ذرے ذرے پر بہار آئی ہوئی
اور فضاؤں میں اُمنڈ آیا ہے طوفان سرور — میں تجھے جانے نہ دوں گی اے مری جان سرور

حامد علی خاں صاحب (حامد) نے "ہمہ گیری عشق" میں کائنات پر عشق کی مختلف انداز میں گرفت کو استادانہ رنگ میں پیش کیا:

میں چشم ازل، چشم ابد، چشم بقا ہوں — موج نگہ کاہکشاں بن کے اٹھا ہوں
نکہت ہے مرے سانس کی ہر موج صبا میں — اک کیف سا پیدا ہے دل ارض و سما میں
میں تاب رخ حسن ہوں میں روح وفا ہوں — میں عارض گل نغمۂ بلبل میں بسا ہوں
ہے برق مرے خندۂ وحشی کی نشانی — ہے رعد مرے نالۂ غمگیں کی کہانی
میں ساز فلک، ساز زمیں، ساز زماں ہوں — میں محرم جاں، پردہ در راز جہاں ہوں

پروفیسر فیض احمد (فیض) نے اپنی نظم "رقیب سے" سنائی۔ میاں بشیر احمد (مرحوم) نے چار رباعیاں

سنائیں - ایک رباعی بعض لفظوں کی تکرار کے باعث خاصی دلکشی اور غنائیت لیے ہوئے ہے :

کچھ کام ہیں ایسے کہ پشیماں ہوں میں   کچھ کام ہیں ایسے بھی کہ نازاں ہوں میں
اب ناز کروں اپنی پشیمانی پر   یا ناز پہ پھر اپنے پشیماں ہوں میں

ہمایوں کے اس خاص شمارے کے اختتام پر مشاعرے میں پڑھی جانے والی غیر طرحی غزلوں میں سے صرف چھ غزلیں درج کی گئی ہیں - پہلی غزل چوہدری خوشی محمد ناظر کی ہے جو انھوں نے جسٹس میاں شاہ دین مرحوم کی یاد میں کہی - یہ غالباً نظیر اکبرآبادی کی اس غزل سے متاثر ہو کر کہی گئی ہے جس کا یہ شعر بڑا مشہور ہے :

ملو جو ہم سے تو مل لو کہ ہم بنوکِ گیاہ   مثالِ قطرۂ شبنم رہے رہے نہ رہے

ناظر کے شعر ملاحظہ ہوں :

وہ ہمنوا مرے ہم داستاں رہے، نہ رہے   حدیث عشق کے جو قصہ خواں رہے، نہ رہے
وہ عہد گل کے جو مرغان نغمہ خواں نہ رہے   اب اس چمن میں مرا آشیاں رہے، نہ رہے

اس رسالے سے یہ بھی پتا چلا (کم از کم راقم کو) کہ خان بہادر نواب احمد یار خاں دولتانہ بھی شاعر تھے - ان کی غزل علامہ اقبال کے رنگ میں ہے اور استادانہ ہے - بعض اشعار سادگی کے ساتھ ساتھ بھرپور تاثیر کے حامل ہیں :

عقل اسے نہ پا سکی منزل مہر و ماہ میں   عشق نے جل کے رکھ دیا آئینہ جلوہ گاہ میں
طائر سدرہ آشیاں قید قفس سے کیا بچے   انجم چرخ دانہ ہوں جب مری دام گاہ میں
مجھ سے نہاں ہو کچھ تو میں اس کی تلاش بھی کر لوں   یہ بھی جہاں نگاہ میں وہ بھی جہاں نگاہ میں
گر تجھے اشتیاق ہے اپنے سواد دل میں دیکھ   شمع ازل کی روشنی مہر میں ہے نہ ماہ میں

دینا ناتھ مست کاشمیری، صدر بزم اردو جموں و کشمیر نے اسی بحر میں لیکن الگ قافیے کے ساتھ غزل سنائی :

مجھ کو کرے گی ان سے کیا گردش آسماں الگ   دور نظر سے ہوں تو ہوں دل سے ہیں وہ کہاں الگ
محشر جوش عشق میں بات نہ دل کی کہہ سکا   میں رہا گم سکوت میں وہ رہے بدگماں الگ
تجھ کو سمجھ سمجھ کے بھی کچھ نہ سمجھ سکا کوئی   دونوں جہاں میں تو عیاں پھر بھی ترا جہاں الگ

جلال الدین اکبر نے اپنی طویل بحر کی غزل میں "درد عشق اور سوز محبت اور" "دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی" کی کیفیت بیان کی :

اب حسن و عشق میں فرق نہیں اب دونوں کی اک حالت ہے   میں ان کو دیکھتا رہتا ہوں وہ مجھ کو دیکھتے رہتے ہیں

ہمدرد نہیں ہمراز نہیں، کس سے کہیے، کیونکر کہیے   جو دل پہ گذرتی رہتی ہے جو جان پہ صدمے سہتے ہیں
اکبر شاید دل کھو بیٹھے وہ جلسے وہ احباب نہیں   تنہا خاموش سے پھرتے ہیں ہر وقت اداس سے رہتے ہیں

محمد علی خاں اثر رام پوری نے چھوٹی بحر میں جو غزل سنائی وہ سہل ممتنع، رموز و محاورہ اور صنائع بدائع کا ایک حسین و دلکش نمونہ ہے :

ہائے دل یاد خدا بھول گیا   قبلہ کو قبلہ نما بھول گیا
لذت کاوش ناوک کو نہ پوچھ   درد اٹھا تو دوا بھول گیا
جب تری موہنی صورت دیکھی   سارے شکوے بخدا بھول گیا
میٹھی میٹھی تری باتیں سن کر   تلخیٔ جور و جفا بھول گیا
ہائے اک بات رہی جاتی ہے   کچھ ابھی کہنے کو تھا، بھول گیا
ہو گئی سینکڑوں وعدوں کی وفا   اس نے جب ہنس کے کہا "بھول گیا"
یاد رکھنے کی ہے یاد اس کی اثر   اور جو بھول گیا بھول گیا

آخری غزل بدر غازی پوری کی ہے۔ دو ایک شعر سنیے :

اس گلی میں ذرے چننے سے مجھے فرصت کہاں   میں مرتب کر رہا ہوں داستانِ دل ابھی
جزر و مد، طوفان برق و باد، گرداب و حباب   اس غضب کی بھیڑ میں گم ہو گیا ساحل ابھی
چشمِ تر، نوک مژہ، راہ وفا، دامان دوست   ایک ایک آنسو کو جانا ہے کئی منزل ابھی

جیسا کہ ملاحظہ ہوا اس مشاعرے میں مسلمان شعرا کے علاوہ ہندو شعرا بھی شریک تھے۔ ہندو شعرا کے کلام سے نتیجہ بآسانی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اردو شعر و ادب سے انتہائی وابستگی کے سبب یہ شعرا تعصب اور تنگ نظری سے کوسوں دور تھے۔ اس مشاعرے میں شرکت کرنے والے اکثر شعرا اب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں، اردو ادب کی جو خدمت انھوں نے کی ہے وہ انھیں مدتوں زندہ رکھے گی۔